تحریکِ پاکستان کے مذہبی عوامل

محمد نذیر کاکاخیل

قوموں کی تشکیل میں تقریباً ہر دَور میں مذہب کو بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر ایک خاص مقام حاصل رہا ہے۔ مذہب اخلاق کا درس دیتا ہے اور صحیح مذہبی خطوط پر جو بھی معاشرتی، معاشی یا سیاسی نظام تعمیر کیا جاتا ہے اگر اسے بدلے اور بدلتے حالات اور تقاضوں سے ہم آہنگ رکھا جائے تو وہ زیادہ پائیدار ہوتا ہے۔ جدید دَور کے روحانی بحران نے مذہب کی اہمیت اور بھی بڑھا دی ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ مذہب کے خلاف افکار نے بذاتِ خود "ایک مذہب" کا رُوپ دھارنے کی ناکام کوشش کی ہے۔ البتہ اگر ایک مذہب انسانیت کو رنگ، خون، علاقہ، زبان اور ذات پات کی بنا پر تقسیم کرے تو بلاشبہ ایسا مذہب نہ صرف "ترقی" کے راستے میں رکاوٹ بنا رہتا ہے بلکہ امنِ عالم کے لئے بھی خطرے کا باعث بھی بن سکتا ہے۔

اس ضمن میں اسلام ایک اپنا مقام رکھتا ہے، اس کی روحانی تعلیمات اور اخلاقی ضابطے عالمگیر ہیں۔ اس کا خطاب "یَا اَیُّھَا النَّاس" سے شروع ہوتا ہے، قرآن مجید کا یہ اسلوب پوری انسانیت کو ایک وحدت تصور کرتا ہے لہٰذا یہ انسانیت کو گروہوں میں تقسیم نہیں کرتا بلکہ اسے مجتمع کرنے کے لئے کوشاں ہے۔ انفرادی و اجتماعی زندگی کے متعلق بھی اسلام ایک خاص فلسفہ رکھتا ہے جس پر تاریخ کے ایک عہد میں کامیاب تجربہ بھی کیا جا چکا ہے۔

مندرجہ بالا نکات کے پیشِ نظر، جب ہندوستان میں عام آزادی کی روح بیدار ہو گئی، تو مسلمانانِ ہند کے سامنے دو متبادل رستے تھے یا تو وہ اپنی منفرد حیثیت چھوڑ کر عہد جدید کی قومیت

میں اپنے آپ کو گم کر دیں یا اپنی جداگانہ ثقافتی و دینی حیثیت اور اپنے طور طریقوں کے مطابق زندگی گزارنے کی غرض سے ایک سیاسی نصب العین کو اختیار کریں۔ اُنھوں نے دوسرا راستہ اختیار کرتے ہوئے پہلے اپنی جداگانہ حیثیت برقرار رکھنے کی کوشش کی اور پھر مکمل آزادی کا نعرہ بلند کیا۔ لہٰذا آزادی کی عام تحریکوں کے برعکس مسلمانانِ ہند کی آزادی کی تحریک کی بنیاد صرف معاشرتی، معاشی اور سیاسی عوامل پر نہیں رکھی جا سکتی تھی کیونکہ جن علاقوں پر مشتمل ریاست قائم کرنی تھی وہاں کے لوگوں میں صرف اسلام اور اسلامی ثقافت ہی قدرِ مشترک تھا۔ ان کا معاشرتی کلچر مذہب کے دائرے سے باہر مختلف تھا۔ لہٰذا اسلام کے علاوہ کوئی قدر، کوئی نعرہ مسلمانانِ ہند کو متحد نہیں رکھ سکتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ تحریک کی کامیابی نے کسی قوم یا قومیت کو جنم نہیں دیا بلکہ پہلے سے موجود قومیت کے تصور نے پاکستان کو جنم دیا۔ لہٰذا "پاکستان مسلم قومیت کا آغاز نہیں بلکہ نتیجہ ہے"

یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ جب ساتویں صدی عیسوی میں اسلام کا ظہور ہوا تو اس کا خطاب مخصوص علاقے یا قوم سے نہیں بلکہ پوری انسانیت سے تھا۔ اس کی بنیاد عدلِ اجتماعی کے مسلّمہ اور عالمگیر اصولوں پر رکھی گئی۔ اس کی امن پسندی اور انسانی قدر و منزلت کا یہ عالم تھا کہ اس نے نہ خود دوسروں پر زیادتی کی اور نہ کسی کو اس کی اجازت دی لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ ۝ اس کا نصب العین قرار پایا۔ لیکن اگر استبدادی قوتوں کے مظالم غریب عوام پر عرصۂ حیات تنگ کر دیں اور وہ انسانیت کے امن و چین کے لئے مستقل خطرہ بنے رہیں تو مظلوم افراد و اقوام کی حمایت میں اُٹھ کھڑے ہونا اخلاقی فریضہ ہے کیونکہ قرآن ظلم و بربریت اور شر و فساد کو فتنہ قرار دیتا ہے اور اس کے بارے میں حکم ہے کہ " قَاتِلُوهُمْ حَتَّىٰ لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ "

یہ تاریخی حقیقت بھی اپنی جگہ اٹل ہے کہ جب ایک قوم اپنے بنیادی اصولوں سے منہ موڑ لیتی ہے یا انہیں سیاسی مصلحتوں کے تابع بنا لیتی ہے تو اس کا زوال شروع ہو جاتا ہے۔ بدقسمتی سے برصغیر میں بھی یہی ہوا۔ نفاق، باہمی رقابتوں، غلط رسومات اور اسلام کی جڑیں کھوکھلی کرنے والی تحریکوں نے مسلمانوں کے مذہبی عقائد کو متزلزل کرنا شروع کر دیا۔ اصل دین کو چھوڑ کر مسلمان بے بنیاد رسومات کے چکر میں اس طرح پڑ گئے کہ خود اسلام ان کی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ

ہوا کہ جن غلط رسومات اور عقائد کے خلاف اسلام کا ظہور ہوا تھا اور جس استحصالی نظام کو مٹانے اسلام آیا تھا اب وہی عقائد اور نظام اسلام کا روپ دھارنے لگا۔ یہ عوامل مسلمانوں کی روحانی کمزوری کا باعث بنے اور روحانی زوال اپنے ساتھ سیاسی زوال بھی لے آیا۔

ضرورت اس امر کی تھی کہ اسلامی اقدار کا پھر سے جدید حالات و تقاضوں کے مطابق احیاء کیا جائے تاکہ مسلمان فلاح پا سکیں۔ اٹھارویں صدی عیسوی میں شاہ ولی اللہؒ نے مسلمانانِ ہند کے عقائد درست کرنے، اُن کے باہمی اختلافات کم کرانے اور ان کی کھوئی ہوئی عظمت کو بحال کرنے کا بیڑا اُٹھایا۔ اُن کی مذہبی، علمی اور سیاسی تحریک نے مسلمانوں میں بیداری کی روح پھونکنی شروع کر دی۔ سید احمد شہید بریلویؒ اور حاجی شریعت اللہ کی تحریکیں اس سلسلے کی کڑیاں تھیں۔ شاہ ولی اللہ اور سر سید احمد خان کے درمیانی عرصہ میں جتنی دوسری سیاسی جنگیں ہوئیں ان میں مذہبی عنصر غالب تھا اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ مسلمانانِ ہند کس طرح اپنے ثقافتی ورثے کے تحفظ اور سیاسی اقتدار کے بچاؤ کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہے تھے۔

جب ہندوستان میں انگریزوں نے مکمل طور پر قدم جمائے اور جدید تعلیم عام ہوئی تو مسلمان قوم ایک نئے مسئلے سے دوچار ہوئی۔ ایک طرف جدید مغربی خیالات نے مسلمانوں کے افکار و عقائد پر یلغار شروع کی اور دوسری طرف بعض رجعت پسند مذہبی جماعتوں نے ان کے کلچر کو ملیامیٹ کرنے کی ٹھانی۔ بیسویں صدی کے آغاز سے لے کر قیامِ پاکستان تک کے درمیانی عرصہ میں اگر مسلمان زعماء اور تحریکِ پاکستان کے سرکردہ لیڈروں کی نجی گفتگو، تقاریر، خطوط، اخباری بیانات، یادداشتوں، سرکاری ریکارڈ اور مسلمان اخبارات و رسائل کا سرسری جائزہ بھی لیا جائے تو یہ نتیجہ اخذ کرنا مشکل نہیں کہ مسلمانانِ ہند کے لئے اسلامی ثقافت اور مسلمانوں کے مخصوص مفادات کے تحفظ کا مسئلہ کتنا اہم تھا۔ علی گڑھ کالج کی تاسیس، مسلم لیگ کا قیام، معاہدۂ لکھنؤ، خلافت تحریک، قائداعظم کے چودہ نکات، الٰہ آباد کے مسلم لیگ کے اجلاس میں علامہ اقبالؒ کا خطبۂ صدارت، گول میز کانفرنسیں، مسلم لیگ کی عرضداشتیں، قراردادِ لاہور، گاندھی جناح مذاکرات اور آزادی سے قبل ہونے والے سیاسی واقعات اس بات کی شہادت کے لئے کافی ہیں کہ مسلمانوں کے مذہبی اقدار کا مسئلہ ان کی نظروں میں کس قدر

شدت اختیار کر گیا تھا۔ تحریک آزادی میں مذہبی عوامل نے وہ کردار ادا کیا جس کی وجہ سے ناممکن، ممکن بن گیا۔

اس مختصر سے مضمون میں تفصیلات میں جانا تو ممکن نہیں البتہ چند مثالوں سے نفسِ مضمون کو واضح کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

تحریکِ تعلیم جدید کے سالار سر سید احمد خان کی علمی، دینی، سماجی تحریک کے ساتھ ہی "دو قومی نظریہ" کی صدا نئے انداز سے برصغیر ہند میں بلند ہوتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ آپ شروع میں خالص تعلیمی دعوت کے لئے وقف تھے لیکن تجربے اور حالات نے جلد آپ پر واضح کیا کہ سیاسی زندگی کے مقاصد کے بارے میں ہندوؤں اور مسلمانوں میں بہت بڑا فرق ہے۔ دونوں مذہبی اور ثقافتی طور پر الگ الگ قومیں ہیں، جن کو سیاسی طور پر ایک قوم بنانا از حد مشکل ہے، آپ پر یہ بھی ثابت ہو گیا کہ مذہب ہی وہ رشتہ ہے جو مسلمانانِ ہند کی مشکلات کا مداوا اور ان کے اتحاد کا باعث بن سکتا ہے۔ آپ کا یہ خیال اپنی جگہ بالکل درست تھا کہ جب تک مسلمان اسلام کے اصولوں پر سختی سے کاربند نہیں ہوں گے اور اسلام کے بتائے ہوئے اصولوں کی روشنی میں جدید حالات اور تقاضوں کے مطابق اپنے آپ کو نہیں ڈھالیں گے، وہ فلاح نہیں پا سکیں گے۔ علی گڑھ کالج اس مقصد کے حصول کا ایک ذریعہ تھا۔

علامہ اقبال کی ابتدائی شاعری میں وطنیت کی جھلک ضرور نظر آتی ہے لیکن وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ آپ کے افکار میں تبدیلی آتی رہی، آپ نے اپنی نظموں کے ذریعہ مسلمانانِ ہند میں ایک نیا ولولہ پیدا کیا۔ آپ مسلمانوں کو برابر یہ احساس دلاتے رہے کہ وہ اپنی ذات میں ایک ایسی قوم کے سپوت ہیں جو اپنے اصولوں، اندازِ فکر اور فلسفۂ حیات کی وجہ سے دوسری اقوام سے ممتاز ہے۔ مذہب کی بنیاد پر مسلمانانِ ہند کے لئے علیحدہ وطن کا خاکہ آپ کے پختگیٔ افکار کا نتیجہ ہے۔ آپ نے مارچ ۱۹۳۷ء میں اپنے ایک خط میں قائدِ اعظم کے نام لکھا:

"ہمیں اس حقیقت کو ہرگز پسِ پشت نہیں ڈالنا چاہیئے کہ ایشیا میں اسلام کے اخلاقی و سیاسی اقتدار کا دارومدار تمام تر ہندوستان کے مسلمانوں کی مکمل تنظیم پر ہے۔ آپ کو چاہیئے کہ پوری قوت اور قطعی وضاحت کے ساتھ ہندوستان

میں مسلمانوں کی جداگانہ سیاسی وحدت کا بطور نصب العین اعلان کر دیں۔۔۔۔۔ صرف معاشی مسئلہ ہی کوئی واحد مسئلہ نہیں جس سے ہم دوچار ہیں۔ مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے ثقافتی مسئلہ بہت اہمیت کا حامل ہے۔"

علامہ اقبال کے خطبۂ الٰہ آباد (۱۹۳۰ء) اور مندرجہ بالا خط سے یہ بات صاف عیاں ہے کہ پاکستان کا مطالبہ خالصتاً مذہب کی بنیاد پر کیا گیا تھا۔ یہاں مذہب بمعنیٰ عام مذہب نہیں بلکہ اسلام تھا جس کا معاشرتی، معاشی، سیاسی اور اخلاقی مسائل کے بارے میں ایک مخصوص فلسفہ ہے اور جو نجی اور اجتماعی زندگی میں بھی اپنے مخصوص روحانی و اخلاقی تعلیمات کو پیشِ نظر رکھنے پر زور دیتا ہے۔

قائد نے اپنی سیاست کا آغاز ہندو مسلم اتحاد قائم کرنے کی کوششوں سے کیا۔ آپ ہندو مسلم اتحاد کے سفیر کے نام سے مشہور تھے۔ بعد میں آپ ۱۹۱۶ء میں معاہدۂ لکھنؤ کے ذریعہ دونوں قوموں میں اتحاد قائم کرنے میں کامیاب بھی ہو گئے۔ لیکن بعد میں آنے والے یکے بعد دیگرے واقعات نے آپ کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ مسلمان سیاسی طور پر ایک الگ قوم ہیں جو اپنی ثقافت، فلسفۂ حیات، تاریخ، روایات اور بین الاقوامی قانون کی رو سے الگ تشخص کی مالک ہے۔ ۱۹۴۰ء میں آپ نے واشگاف الفاظ میں فرمایا:

"عرصے سے مجھے ایک چیز تکلیف دے رہی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ غور کریں اور یہ قابلِ غور مسئلہ ہندو مسلم اتحاد کا ہے۔ گزشتہ چھ سالوں سے میں نے اپنا سارا وقت اسلامی تاریخ اور اسلامی قانون کے مطالعے کی نذر کر دیا اور میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ یہ غیر ممکن ہے اور ناقابلِ عمل بھی۔"

یہ اقتباس اس بات کی شہادت کے لئے کافی ہے کہ قائد علیحدہ وطن کا مطالبہ اسلام کی بنا پر کر رہے تھے اور انہیں یقین تھا کہ مسلمانوں کی نجات صرف اور صرف اسلامی اصولوں پر عمل پیرا ہونے میں مضمر ہے۔ ظاہر ہے ہندوؤں کے ساتھ اکٹھے رہنے سے ہم انفرادی طور پر تو اسلامی اصولوں کو روبہ عمل لا سکتے تھے لیکن اجتماعی طور پر ہرگز نہیں۔

یہاں قدرتی طور پر نئی نسل کے ذہنوں میں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ تحریکِ پاکستان کی بنیاد

مذہب پر کیوں رکھی گئی یا یہ کہ تحریک کے بنیادی عوامل میں مذہب پر کیوں سارا زور دیا گیا جب کہ اور بھی محرکات تھے؟ جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے اسلام صرف ایک مذہب ہی نہیں بلکہ ایک ضابطہ حیات بھی ہے جو زندگی کے مختلف پہلوؤں میں انسانوں کی ھدایت و رہنمائی کرتا ہے۔ یہاں اس امر کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ جب تحریکِ آزادی کے روح رواں اسلامی نظام کے نفاذ کی بات کرتے تھے تو ان کا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا کہ بیسویں صدی کی اسلامی ریاست پاکستان میں ساتویں صدی کی اسلامی ریاست کا احیا کیا جائے گا یا یہ کہ عباسی دور یا مغل انڈیا کے سیاسی، معاشرتی اور معاشی نظام کی ہو بہو نقل کی جائے گی۔ بلکہ اس کا مطلب یہ تھا کہ اسلام کے عدل اجتماعی کے عمومی اصول جو کون و مکان سے بالاتر ہیں اور اس کے روحانی و اخلاقی تعلیمات کو انفرادی اور اجتماعی زندگی میں بروئے کار لایا جائے گا۔ ظاہر ہے یہ ضابطے بیسوی صدی کے سائنسی دور میں کسی طرح بھی ترقی کے رستے میں رکاوٹ نہیں بن سکتے بلکہ اُن پر عمل پیرا ہونے ہی میں ہماری ترقی کا راز پنہاں ہے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ برصغیر ہند کے مسلمانوں نے پاکستان کا مطالبہ مذہب کی بنیاد پر کیا تو بعض حلقوں کی طرف سے ایک اعتراض یہ تھا کہ مذہب تو خدا اور بندے کے درمیان ایک نجی معاملہ ہے اس کو سیاست میں لانے سے کیا فائدہ! مسلمانوں کی طرف سے یہ دلیل تھی کہ اسلام ایک جامع نظام حیات ہے جو انفرادی اور اجتماعی زندگی کے جملہ شعبوں سے قریبی تعلق رکھتا ہے۔ ہم انفرادی اور اجتماعی معاملات کو اسلامی اصولوں کے مطابق ڈھالنے کی خاطر جدا حکومت ضرور چاہتے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہم دوسرے مذاہب کے لئے خطرہ بن جائیں۔ اس ضمن میں قائد کی وہ تقریریں بھی اہم ہیں جو انھوں نے قیام پاکستان کے بعد دستور ساز اسمبلی میں اور دوسرے موقعوں پر کیں۔ فروری ۱۹۴۸ء میں امریکی عوام کے نام ایک نشریے میں آپ نے فرمایا:

"پاکستان کا دستور آئین ساز اسمبلی بنائے گی مجھے نہیں معلوم کہ اس کی آخری شکل کیا ہوگی لیکن مجھے یقین ہے کہ یہ جمہوری طرز کا آئین ہوگا جس میں اسلام کے بنیادی اصول شامل ہوں گے۔"

لیکن ساتھ ہی ساتھ آپ یہ بھی فرما گئے کہ پاکستان اس مفہوم میں ہرگز مذہبی پیشواؤں کی ریاست

[The Cratic State] نہیں ہو گی جسے چند مذہبی رہنما چلائیں گے۔ آپ نے واضح الفاظ میں فرمایا کہ ہمارے ساتھ غیر مسلم، ہندو، عیسائی، پارسی بھی ہیں جو پاکستانی ہیں۔ انہیں وہ تمام حقوق و مراعات حاصل ہوں گے جو دوسرے شہریوں کو حاصل ہوں گے۔

قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ تحریکِ آزادی کے دَوران مسلمانوں کا ایک طبقۂ علماء ایسا بھی تھا جس نے تحریکِ پاکستان کے خلاف دانستہ یا نادانستہ طور پر یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ تجدد پسند طبقہ ایک اسلامی ریاست نہیں بلکہ دنیاوی ریاست [Secular State] بنا رہا ہے۔ لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ عامۃ الناس کے جوش و خروش میں اس قسم کے خیالات کی وجہ سے کوئی فرق نہیں پڑا۔ اس کی کئی ایک وجوہ ہو سکتی ہیں؛

اوّلاً: یہ طبقہ مسلمانوں اور جدید تعلیم کے درمیان آڑے آیا تھا۔

دوم: یہ طبقہ تحریکِ پاکستان کی تو مخالفت کر رہا تھا لیکن خود اُس کے پاس کوئی ٹھوس، مثبت اور قابلِ عمل پروگرام نہیں تھا۔

سوم: ان کے باہمی اختلافات کی وجہ سے قوم کے لئے ان کی قیادت میں ایک پلیٹ فارم پر جمع ہونا ممکن نہ تھا۔

جب کہ یہی لوگ مسلم لیگ کی قیادت میں متحد تھے۔ کیونکہ تحریکِ آزادی کے زعماء نے علی الاعلان کہا تھا کہ پاکستان بیسویں صدی کی ایک اسلامی جمہوری ریاست ہو گی جہاں کے باشندوں کے ساتھ رنگ، نسل، فرقہ، علاقہ یا زبان کی بنیاد پر امتیازی سلوک نہیں کیا جائے گا بلکہ اسلام کے عدلِ اجتماعی کے جملہ اصولوں کو روبہ عمل لایا جائے گا۔

اس طبقۂ علماء کے مقابلے میں عامۃ الناس کا روشن خیال طبقہ کی قیادت قبول کرنا اور ان کے جھنڈے تلے جمع ہو جانا اس بات کا ثبوت ہے کہ اب وہ پُرانے ڈگر پر چلنے اور اسلام کو محض چند رسومات تک محدود رکھنے یا عباسی اور مغلیہ دَور کے سیاسی، معاشی اور معاشرتی نظام تک مقید رکھنے کے حق میں نہیں تھے۔ وہ اسلام اور اسلامی اقدار کا احیاء بھی چاہتے تھے لیکن ساتھ ساتھ جدید سائنسی دَور میں ترقی کی دَوڑ میں اقوامِ عالم سے پیچھے رہنا بھی پسند نہیں کرتے تھے۔

قرار دادِ لاہور (مارچ ۱۹۴۰ء) کے بعد آزادی کی تحریک جس تیزی کے ساتھ مقبول ہوئی وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ مسلمانانِ ہند کے دل کس طرح بیسویں صدی کی جدید اسلامی جمہوریہ پاکستان میں اسلامی اقدار کے تحفظ اور مخصوص فلسفۂ حیات کے مطابق نئے حالات اور تقاضوں کی روشنی میں انفرادی اور اجتماعی زندگی بسر کرنے کے لئے دھڑک رہے تھے اور یہ کہ وہ ایسی ریاست کے قیام کے لئے کتنے بے تاب تھے جہاں ہر قسم کے استحصال سے پاک صاف اسلامی معاشرہ جدید خطوط پر نئے سرے سے قائم کیا جائے گا۔ چنانچہ مسلمانوں کی آرزوؤں کا مقصد اور قائد کی سیاست کا محور یہ تصور رہا کہ "مسلمان ایک الگ قوم ہیں اور مخصوص صلاحیتوں کے ارتقاء کے لئے بالکل الگ اور آزاد فضا چاہتے ہیں"۔ چونکہ ان کی نیت میں خلوص تھا اور ان کی خدمات بے لوث تھیں۔ اس لئے وہ اپنے نصب العین کو بروئے کار لانے میں کامیاب رہے۔

۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان کا معرضِ وجود میں آنا بذاتِ خود کوئی مقصد نہیں تھا بلکہ یہ حصولِ مقصد کا ایک ذریعہ تھا۔ بانیٔ پاکستان قائد کے ارشاد کے مطابق:

"خیال یہ تھا کہ ہم ایک ایسی مملکت کے مالک ہوں جہاں ہم اپنی روایات اور تمدنی خصوصیات کے مطابق ترقی کر سکیں۔ جہاں اسلام کے عدل و مساوات کے اصولوں کو آزادی سے بر سرِ عمل آنے کا موقع حاصل ہو"۔

اور یہ کہ جہاں: "ہم اپنی جمہوریت کی بنیادیں صحیح معنوں میں اسلامی تصورات اور اصولوں پر رکھیں"۔

معترضین یہ سوال بھی اُٹھا سکتے ہیں اور اکثر اُٹھاتے بھی ہیں کہ اگر نظریۂ پاکستان کی بنیاد اسلام پر رکھی گئی تھی اور اسلام ہی پاکستانی مسلمانوں کو متحد و متفق رکھ سکتا تھا تو ۱۹۷۱ء میں وہ بندھن کمزور کیوں پڑ گیا اور مشرقی پاکستان بنگلہ دیش کیسے بنا؟ یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ قائد کی بے وقت رحلت کے بعد نظریۂ پاکستان کی روح پر عمل پیرا ہونے کی بجائے قوم کو گروہی اور علاقائی سیاست کا شکار بنا دیا گیا۔ اور یہ محدود سیاست جمہوری عمل اور اداروں کے پنپنے کے رستے میں حائل رہی۔ اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ ٹھوس اور مضبوط بنیادوں پر ملک کے سیاسی، معاشی و معاشرتی ڈھانچے کی تعمیر نہیں ہو سکی جس

استحصالی نظام سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے قوم قائد کے جھنڈے تلے جمع ہوگئی تھی، وہی نظام نئے روپ میں قوم پر مسلط کر دیا گیا۔ سرمایہ دار اور جاگیردار طبقہ اسلام کے نام پہ کروڑوں عوام کا استحصال کرتا رہا۔ جب بنگلہ دیش ہمیں خدا حافظ کہہ رہا تھا اس وقت تو بیچارے اسلام کو ملک کے سرکاری مذہب ہونے کا شرف تک بھی نہیں بخشا گیا تھا۔ اس میں قصور اسلام کا نہیں بلکہ اس استحصالی نظام کا تھا جو اسلام کے مقابلے میں اپنایا گیا تھا۔ اور جب جوش کی جگہ ہوش نے سنبھالی تو وہ کون سی قدر مشترک تھی جس نے پاکستان اور بنگلہ دیش کو ایک دوسرے سے قریب تر کر دیا؟ کیا یہ اسلام کا روحانی رشتہ نہیں تھا؟

مختصراً یوں کہا جا سکتا ہے کہ برصغیر ہند میں جب مذہبی رہنماؤں نے مسلمانوں کو خواب غفلت سے جگایا، تو سرسید احمد خان اور اُن کے رفقائے کار نے ان کی منزل" دو قومی نظریہ" کی روشنی میں متعین کی، علامہ اقبال نے اس نظریہ کی بنیاد پر علیحدہ مسلم ریاست کا خاکہ پیش کیا اور قائد نے اس خاکہ میں رنگ بھرنا شروع کیا تو یہاں اسلام ہی تھا جو بنیادی کردار ادا کرتا ہوا تحریک آزادی کو آگے بڑھاتا رہا۔

مصادر

۱ - قرآن کریم۔

۲ - رئیس احمد جعفری۔ قائداعظم اور اُن کا عہد۔ لاہور ۱۹۶۲ء

۳ - رئیس احمد جعفری۔ خطباتِ قائداعظم۔ لاہور ۱۹۶۱ء

۴ - عاشق حسین بٹالوی۔ اقبال کے آخری دو سال۔ کراچی ۱۹۶۱ء

۵ - Jamil-ud-Din Ahmad : The Struggle for Pakistan 3 Vols. Lahore 1968.

۶ - Jamil-ud-Din Ahmad : Speeches and Writings of Mr. Jinnah, Lahore, 1960.

۷ - Shamloo: Speeches and Statements of Iqbal, Lahore, 1948.

۸ - G. W. Choudhury: Constitutional Developments in Pakistan. [2nd ed.] Lahore, 1969.

۹ - Leonard Binder: Religion and Politics in Pakistan, Los Angeles, 1961.